ایک علمی اور تہذیبی شخصیت کی یاد میں

سیّد حمید حسین جونپوری

(کچھ یادیں اور باتیں)

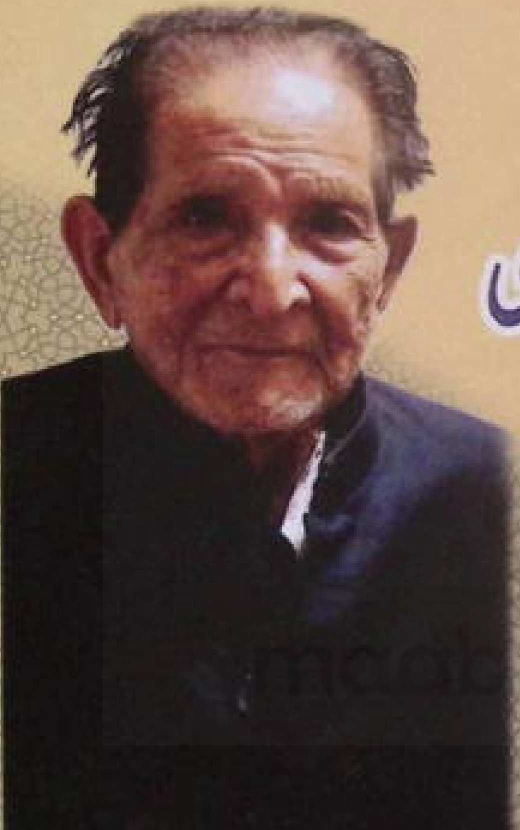

سید ارتضیٰ عباس نقوی

پیشکش

سید قیصر مسعود جعفری

ایک علمی اور تہذیبی شخصیت کی یاد میں

سیّد حمید حسین جونپوری

(کچھ یادیں اور باتیں)

ان یادداشتوں کو ۱۰ نومبر ۲۰۱۸ء کو مرحوم
کی مجلسِ چہلم میں تقسیم کیا گیا

سید ارتضیٰ عباس نقوی

پیشکش

سید قیصر مسعود جعفری

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

کتاب : حمید حسین جونپوری (کچھ یادیں اور باتیں)
تصنیف : سید ارتضیٰ عباس نقوی
پیشکش : سید قیصر مسعود جعفری
اشاعت : نومبر ۲۰۱۸ء
طابع : سید غلام اکبر
تعداد : ۵۰۰

کتاب ملنے کا پتہ

F-7 رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد نمبر ۱، کراچی، پاکستان

0346-2781009

maablib.org

فہرست

قطعۂ تاریخ وفات ---------- سید یداللہ حیدر حیدرؔ ---------- ۴

حرفِ مقصد ---------- سید ارتضیٰ عباس نقوی ---------- ۵

حمید بھائی مجھے ایک بار پھر یتیم کر گئے ...!! -- قیصر مسعود جعفری ---------- ۱۳

ہمارے حمید صاحب ... ---------- سید ارتضیٰ عباس نقوی ---------- ۱۵

- کبگاؤں اور ساداتِ مسونڈھا ---------- ۱۶
- شجرۂ نسب ---------- ۱۶
- حمید صاحب کے پردادا مولانا گلشن علی اعلی اللہ مقامہ ---------- ۱۸
- حمید صاحب کے دادا مولانا حاجی محمد حسن اعلیٰ اللہ مقامہ ---------- ۲۱
- حمید صاحب کے دادا کی مجلس چہلم اور اس کا رقعہ ---------- ۲۲
- حمید صاحب کے چچا مولانا سید رضی الدین اعلیٰ اللہ مقامہ ---------- ۲۶
- حمید صاحب کے والد مولانا سید محمد حیدر مرحوم ---------- ۲۷
- حمید صاحب کے حالاتِ زندگی ---------- ۲۷
- ولادت اور بچپن ---------- ۲۷
- سلطان المدارس میں داخلہ ---------- ۲۹
- ہم جماعت اور ہم عصر طلباء ---------- ۳۰
- جن علماء کو حمید صاحب نے دیکھا ---------- ۳۰
- عادات و اطوار ---------- ۳۳
- مرثیوں کا ذوق ---------- ۳۴
- اصفہانی کمپنی میں ملازمت اور پاکستان آمد ---------- ۳۵
- حسینیہ پنجتن کی بنیاد رکھنا ---------- ۳۵
- میری حمید صاحب سے پہلی ملاقات ---------- ۳۶
- خاندانی کتب خانہ ---------- ۳۷
- زیارت عتبات عالیات ---------- ۳۸
- بیماری، وفات اور مدفن ---------- ۳۹

سید یداللہ حیدر حیدرؔ

قطعۂ تاریخِ وفات

سیّد حمید حسین زیدی ابنِ مولانا سیّد محمد حیدر زیدی

ہے فضاء نوحہ خواں حمید حسین — اُٹھ گئے ناگہاں حمید حسین
عشقِ مولا میں روبہ روشہ کے — اب ہیں رطب اللساں حمید حسین
خاندانی شرف رہا جس کے — ہر عمل سے عیاں حمید حسین
طفل ہو یا مُسن تھے سب کے لئے — خوش زباں، خوش بیاں حمید حسین
کتنے ناداروں کے لئے جو رہے — دھوپ میں سائباں حمید حسین
غمزدوں کی ہے ناؤ داد گری — ناؤ کے بادباں حمید حسین
آپ آغوشِ علم میں تھے پلے — یہ شرف کم کہاں حمید حسین
طالب علم کو تھے، علم کے آپ — قلزم بے کراں حمید حسین
بہرِ تاریخ آگیا یک دم — مادّہ یہ برزباں حمید حسین
علم تہذیب جانِ دینِ نبیؐ — اس کا روشن نشاں حمید حسین
باغِ خلدِ بریں میں آج ہے، وہ — زینِ تہذیب جاں حمید حسین

۲۰۱۸ء +۱۱ — ۱۴۲۹ = ۱۴۴۰ھ

حرفِ مقصد

قحط الرجال کے اس دور میں کسی علمی اور تہذیبی شخصیت کا جدا ہو جانا قہر سے کم نہیں ہے۔ لوگ اٹھتے جا رہے ہیں، صحبتیں برہم ہو رہی ہیں، جانے والے واپس نہیں آئیں گے صرف یادیں ہیں جن کے دم سے زندگانی کا کچھ ساز باقی ہے۔ حمید صاحب بھی رخصت ہوئے۔ وہ کراچی میں جونپور کی تہذیب کے آخری آدمی تھے۔ کراچی کے جس علاقے، رضویہ سوسائٹی میں میرا قیام ہے، یہ ابتدا ہی سے علمی اور تہذیبی شخصیات کا مرکز رہا ہے۔ یہاں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی نابغۂ روزگار شخصیات رہتی تھیں، ایک ادبی ماحول تھا، شعر و سخن کے چرچے تھے، اس کے اطراف میں واقع فردوس کالونی اور مسلم کوارٹرز میں بھی خاصی اہم شخصیات کا قیام تھا۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ میں نے ان میں سے چند اہم اور آخری شخصیات کو دیکھا اور ان سے استفادہ کیا۔ ان ہی میں سے ایک سید حمید حسین زیدی مرحوم بھی تھے۔ میری ان سے ملاقاتوں کا عرصہ ۱۵ برسوں پر محیط ہے اور یہ ملاقاتیں مسلسل تھیں، اتنی کہ ان ۱۵ برسوں کو ۳۰ برس سمجھنا چاہیے۔ گھنٹوں لکھنؤ کی پرانی تہذیب کے قصے، علماء کے واقعات، شعراء، قومی شخصیات، کتابیں، قلمی نسخے، قدیم عمارات، تاریخ، حدیث، فقہ، عزاداری، اس طرح کے ہزاروں عنوانات تھے جن پر بات ہوتی تھی۔

انہوں نے ہمیشہ میری قدر کی اور میرے کاموں کو پسند کیا۔ جب بھی میری نئی کتاب آتی ان کا چہرہ کھل اٹھتا اور وہ بے اختیار دعائیں دیتے تھے۔ انہیں مختلف شعراء کے ہزاروں شعر یاد تھے اور موقع کی مناسبت سے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ ان کا حافظہ خداداد

تھا۔ لکھنؤ کی جوانی کے واقعات آئینے کی طرح ان کے سامنے تھے۔ کتنی عظیم شخصیات کو انہوں نے دیکھا تھا۔

ان کے جانے کے بعد میں تہذیب کی دنیا میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ یادیں پلٹ پلٹ کر واپس آ رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کچھ باتوں کو اوراق پر محفوظ کر دوں۔ یہ صرف یادیں نہیں بلکہ ہماری تاریخ بھی ہے جو شاید آئندہ آنے والی نسلوں کے بھی کام آ سکے گی۔

میں محترم قیصر مسعود جعفری کا تہِ دل سے متشکر ہوں کہ انہوں نے اتنے کم وقت میں اس کتاب کو آپ تک پہنچایا جبکہ محرم کی مصروفیات بھی تھیں خدا انہیں جزائے خیر دے۔

سید ارتضیٰ عباس نقوی

۷ر نومبر ۲۰۱۸ء

maablib.org

حمید حسین زیدی کے پردادا مولانا سید گلشن علی اعلیٰ اللہ مقامہ
(ہم عصر میر انیسؔ)

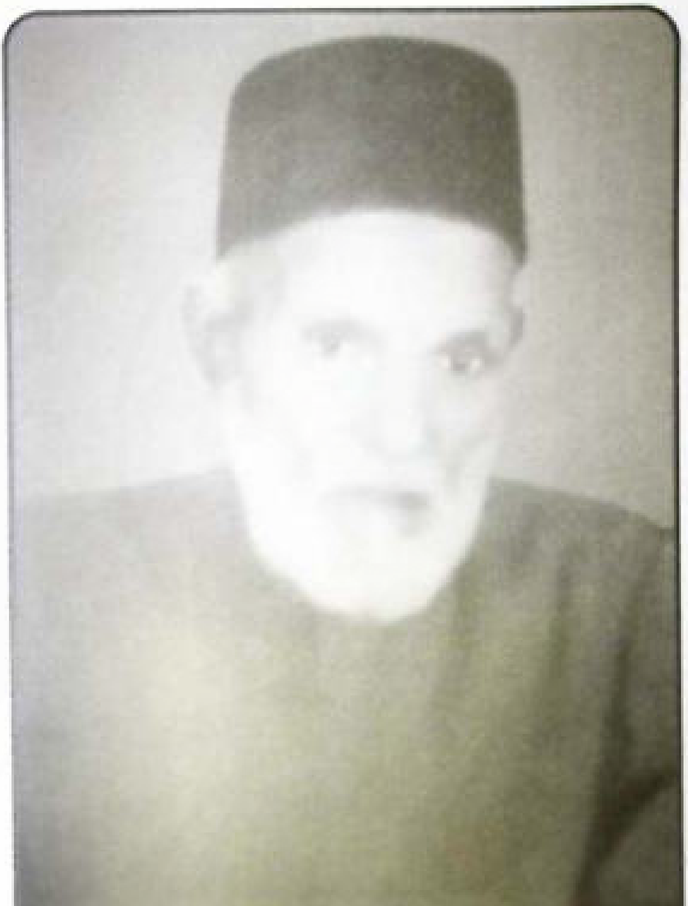

حمید حسین زیدی کے والد مولانا سید محمد حیدر اعلیٰ اللہ مقامہ

حمید حسین زیدی عالمِ شباب میں

حمید حسین زیدی عالمِ پیری میں

بچپن کے ساتھی اور معروف دانشور سید حسین محمد جعفری کے ساتھ، اُن کے گھر پر، سید ارتضیٰ عباس نقوی بھی موجود ہیں

حمید حسین زیدی کے اساتذہ

(سلطان المدارس لکھنؤ میں)

مولانا محمد مصطفیٰ جوہر اعلیٰ اللہ مقامہ

نادرۃ الزمن مولانا ابن حسن صاحب
نونہروی اعلیٰ اللہ مقامہ

مولانا سید محمد عادل رضوی اعلیٰ اللہ مقامہ

سیّد قیصر مسعود جعفری

حمید بھائی مجھے ایک بار پھر یتیم کر گئے۔۔!!

جب مجھے علامہ سیّد ارتضیٰ عباس نقوی نے یہ خبر سنائی کہ "حمید بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔" تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا کہ "میں ایک بار پھر یتیم ہو گیا۔" حمید زیدی صاحب سے میرے تعلقات ۴۰ سال پر محیط تھے، ۱۹۷۸ء میں جب میں نے الائیڈ بینک بطور P.R.O جوائن کیا تو میرا واسطہ "حمید بھائی" سے پڑا، حمید بھائی پرنٹنگ، اسٹیشنری کا کام کرتے ہوئے الائیڈ بینک میں اپنی سروسز فراہم کرتے تھے۔ اُن کے بینک کے پریذیڈنٹ سے لے کر نچلی سطح تک ہر ایک سے تعلقات تھے چونکہ وہ نہایت سادہ انسان تھے، محبت سے گفتگو کیا کرتے تھے اس لئے سب یہی سمجھتے تھے کہ حمید صاحب اُن کے سب سے گہرے دوست ہیں۔ میں چونکہ بینک میں جونیئر اور نیا تھا (جبکہ میرا صحافت سے تعلق تھا اور میں اخبارات میں کالم بھی لکھا کرتا تھا) لیکن "پبلک ریلیشنز" کا تجربہ میرے لئے نیا تھا۔ لیکن حمید صاحب نے میری بڑی رہنمائی اور مدد کی میرا زندگی کا الائیڈ بینک کا سب سے پہلا وزیٹنگ کارڈ بطور "پبلسٹی آفیسر" حمید صاحب ہی نے چھاپا تھا۔ اُس زمانے میں بینک اپنی برانچز کی لسٹ تیار کر رہا تھا اور اُس کو کتابی شکل میں شائع کرنا تھا اور اس مشکل اور ٹیکنیکل کام کو حمید صاحب نے بہت آسان کر دیا میں رات گئے تک اُن کے ہمراہ پریس پر پروف ریڈنگ کیا کرتا تھا۔ ایسے میں محرم آ گئے میں نے ایک دن حمید صاحب سے کہا کہ میں شام کو جلد چلا جایا کروں گا انھوں نے کہا کہ خیریت ہے میں نے جواب دیا کہ مجھے مجلسِ امام حسینؑ میں نشتر پارک جانا ہے تو انھوں نے کہا بھائی ہم بھی مجلس میں نشتر پارک ہی جاتے ہیں تو مجھے ایک جھٹکا لگا کہ حمید صاحب مومن شخصیت ہیں کیوں کہ اُن کے نام سے اب تک کوئی اندازہ بھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہم نے اُن سے مذہبی گفتگو کی تھی۔

اس طرح مجھے تو بہت مسرت ہوئی کہ حمید بھائی اپنے ہی قبیلے کے فرد ہیں پھر تو بعد میں جب زندگی کا کاروبار آگے بڑھتا رہا تو اُن کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا گیا۔ حمید صاحب چونکہ بہت ہی سادہ انسان تھے وہ پتلون اور بشرٹ میں ملبوس ہاتھ میں کالے رنگ کا بریف کیس اُٹھائے آہستہ آہستہ مسکراتے ہوئے، پان چباتے ہوئے جب میرے چیمبر میں آتے تھے تو اُن کو دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوتی تھی۔ چپراسی فوری پانی لے کر آتا اور اُس کے بعد چائے کا دور بھی چلتا۔ پرنٹنگ کے کاموں پر گفتگو ہوتی اس کے ساتھ ساتھ وہ مجھے اپنے ہندوستان کے اور پھر سابقہ مشرقی پاکستان کے قصے سناتے تھے۔ جہاں اُن کا بہت وقت گزرا تھا۔ الائیڈ بینک کے سید عالم حسین، صفدر عباس زیدی، سید جوہر حسین، مقبول سومرو، خادم حسین صدیقی، افتخار جالب اور نہ جانے کتنے ہی لوگ تھے جو اُن کے دوست تھے اور بہت عزت کیا کرتے تھے۔ شہید علامہ عرفان حیدر عابدی سے میرے خیر پور کے زمانے سے تعلقات تھے (علامہ فرقان حیدر عابدی بھی میرے ساتھ الائیڈ بینک میں رہے ہیں اور بہت شاندار وقت گزرا ہے، مولا فرقان بھائی کو سلامت رکھے۔ آمین) جب حمید صاحب کو میرے تعلقات کا علم ہوا تو اُن کے ساتھ دوستی اور بھی مضبوط ہو گئی کیوں کہ حمید زیدی صاحب ایک معروف علمی اور مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور خود بھی مذہبی تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ اسناد بھی رکھتے تھے۔ حمید صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور اس کی گواہی علامہ فرقان حیدر عابدی بھی دیں گے، اُن کے حلقے میں ہر شعبۂ زندگی کے افراد شامل تھے اور حمید صاحب کی ایک بہت ہی اعلیٰ خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ ہر عمر کے افراد میں اُن کی سطح کے مطابق گفتگو کیا کرتے تھے۔ آج حمید بھائی کو مرحوم لکھتے ہوئے میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے لیکن موت برحق ہے سب ہی کو ایک نہ ایک دن اپنے رب کے پاس پلٹنا ہے۔ وہ خوش نصیب ہیں کہ انھوں نے بھرپور زندگی گزاری اور اُن دنوں میں وفات پائی جس کی تمنا سب کرتے ہیں آج حمید صاحب کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ میری آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چل رہا ہے ہم اُن کی مغفرت کے لئے دعا ہی کر سکتے ہیں اور پسماندگان سے تعزیت کرتے ہوئے پروردگار کی بارگاہ میں یہ دعا کرتے ہیں کہ اُن کو "جوارِ معصومین" میں جگہ عطا ہو اور لواحقین کو صبر ملے۔ (آمین)

سید ارتضیٰ عباس نقوی

ہمارے حمید صاحب۔۔۔

شہر جونپور کی بنیاد سلطان فیروز شاہ تغلق فرمانروائے دہلی نے ڈالی۔ ۷۷۲ھ مطابق ۱۳۶۹ء اور ۷۷۵ھ میں جب فیروز شاہ تغلق اتفاقاً ظفر آباد آیا اور جانب مغرب لب دریائے گومتی اسے کچھ زمین ہموار نظر آئی اور پسند خاطر ہوئی تو اُسی وقت حکم دیا کہ وہاں پر شہر آباد ہو۔ شب کو اپنے ابن عم سلطان محمد جونا شاہ کو خواب میں یہ کہتے ہوئے دیکھا کہ یہ شہر میرے نام پر آباد کرو۔ صبح کو سیر و تفریح کے لئے سوار ہوئے تو سلطان کا گزر موضع کرارہ سے ہوا جو گومتی کے کنارے ایک ٹیلہ پر آباد تھا اور وہاں ایک دیول تھا جس کو کرارہ کا دیول کہتے تھے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے مسمار کر کے ایک قلعہ تعمیر ہو اور اُس کے اطراف و جوانب میں شہر آباد ہو۔ چنانچہ تعمیر شروع ہوگئی اور شہر کا نام جونپور رہا۔ اس کی تاریخ ''معمیر جونپور'' سے نکلتی ہے۔ صفی لکھنوی نے اسی شہر کے لئے کہا تھا:

جونپور ارباب علم و فضل کے دارالسرور — کہتے تھے شیراز ہند اکثر تجھے اہلِ شعور
تجھ میں تھے شاہانِ شرقی کے عمارات و قصور — خود تری تاریخ آبادی ہے ''معمیر جونپور''

۷۷۲ھ

اب کہاں وہ بام و در سب ہو گئے زیر و زبر
نام تک میں ہے ترے رنگِ تغیر کا اثر

جونپور کو اوائل ہی سے تاریخی و علمی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں قدیم وقتوں سے صوفیاء، اولیاء، علماء، شعراء اور حکماء جنم لیتے رہے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہاں جمعہ کے دن سات سو علماء کی پالکیاں جامع مسجد آتی تھیں اور یہاں بہت بڑی درس گاہیں تھیں۔ کتنے ہی

ماہرین فن ایسے ہیں جو تاریخ میں مقبول ہوئے لیکن بہت کم افراد جانتے ہوں گے کہ وہ جونپوری سے لکھنؤ ہجرت کر گئے تھے اور لکھنوی کے مشہور ہو گئے۔

کجگاؤں اور ساداتِ مسونڈھا

اسی جونپور کے ملحقات میں ایک گاؤں ''کجگاؤں'' ہے۔ کوئی چار سو برس پہلے یہاں دو بھائی تھے جو ع خ کہلاتے تھے کیونکہ ع خ کے رخسار پر جل نمایاں تھا اور دونوں ہر وقت ٹیڑھے رہتے تھے جب مرے اور قبریں بنیں تو کچھ عرصے بعد دونوں کی قبریں بھی ٹیڑھی ہو گئیں، اس نسبت سے ہمارے گاؤں کو ''ٹیڑھواں'' کہا جانے لگا، اس سے پہلے ساداتِ مسونڈھا کہتے تھے، دیکھتے دیکھتے ٹیڑھواں، کجگاؤں کہا جانے لگا، یہاں سادات کی تاریخ آٹھ سو برس پر محیط ہے۔ حمید صاحب کا خاندان یہاں ۵۰۰ برس سے آباد ہے۔

شجرۂ نسب

سید حمید حسین زیدی جونپوری
(کجگاؤں۔ ساداتِ مسونڈہ)

حضرت امام زین العابدینؑ — زید شہیدؒ — عیسیٰ موتم الاشبال
سید زید مقبول — سید علی — سید محمد
سید زید — سید شاہ عمر — سید زید ظفری
سید داؤد — سید حسین — سید عیسیٰ
سید ابوالفرج واسطی — سید ابوالخیر — سید ابوالفتح
سید محمد — سید بہاؤالدین — سید علی
سید شاہ حسین — سید احمد — سید محمد

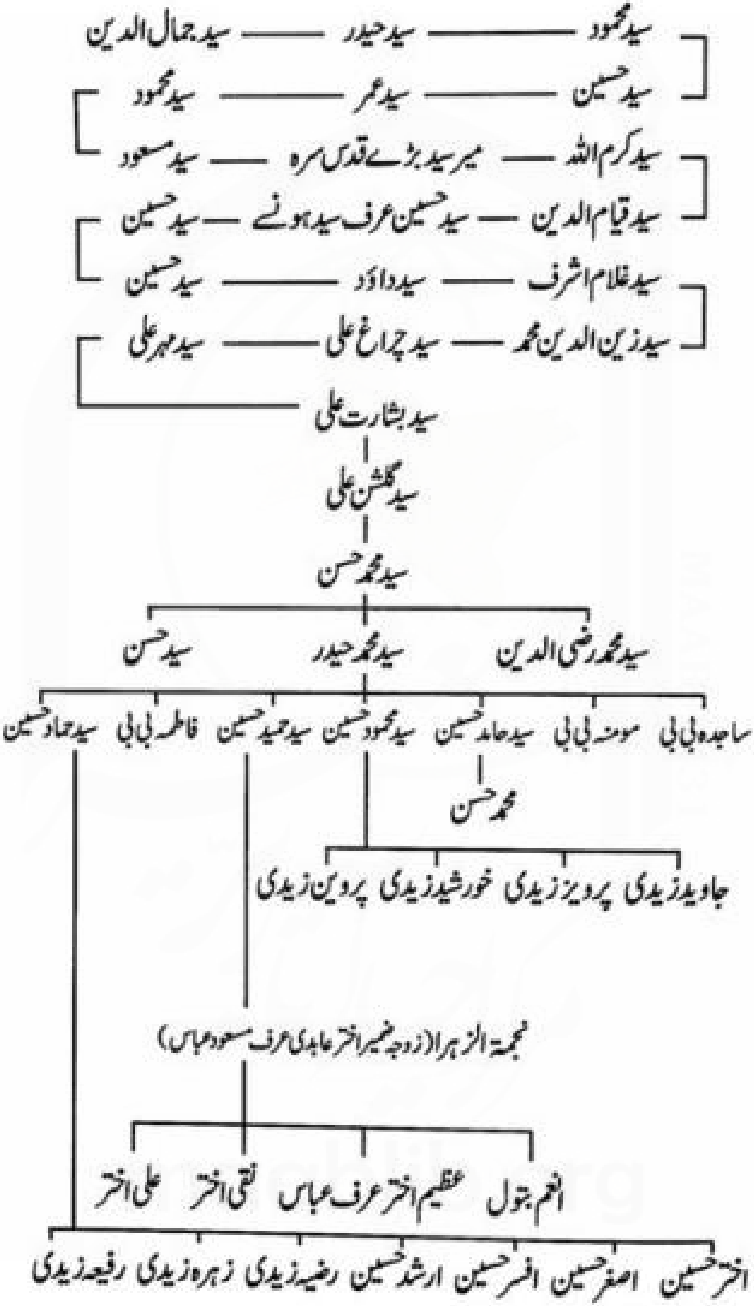
سید محمود — سید حیدر — سید جمال الدین
سید حسین — سید عمر — سید محمود
سید کرم اللہ — میر سید بڑے قدس سرہ — سید مسعود
سید قیام الدین — سید حسین عرف سید ہونے — سید حسین
سید غلام اشرف — سید داؤد — سید حسین
سید زین الدین محمد — سید چراغ علی — سید مہر علی
سید بشارت علی
سید گلشن علی
سید محمد حسن
سید محمد رضی الدین
سید محمد حیدر
سید حسن
ساجدہ بی بی
مومنہ بی بی
سید حامد حسین
سید محمود حسین
سید حمید حسین
فاطمہ بی بی
سید حماد حسین
محمد حسن
جاوید زیدی
پرویز زیدی
خورشید زیدی
پروین زیدی
نجمۃ الزہرا (زوجہ ضمیر اختر عابدی عرف مسعود عباس)
انجم بتول
عظیم اختر عرف عباس
نقی اختر
علی اختر
اختر حسین
اصغر حسین
افسر حسین
ارشد حسین
رضیہ زیدی
زہرہ زیدی
رفیعہ زیدی

حمید صاحب کے پَردادا مولانا گلشن علی اعلیٰ اللہ مقامہ

مولانا گلشن علی (ولادت شوال ۱۲۱۴ھ۔ وفات ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ) اپنے خاندان میں افتخارِ حققدمین ومتاخرین خیال کئے جاتے تھے اور اس خانوادے میں سید بڑے میرؔ سے لے کر اس وقت تک کوئی شخص اس ذہنِ ذکا اور فضل وکمال کا پیدا نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے ثبوتِ امامت پر "جوابِ صواب" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ آپ صاحبِ زہد و تقویٰ تھے۔ آپ نے شروع میں کتب مختصرات مولوی ذاکر علی ساکن مفتی محلہ جونپور سے پڑھا۔ بعدہ بشوق علم ۱۲۳۰ھ میں لکھنؤ تشریف لے گئے اور تھوڑے زمانے میں علوم دینیات مولوی غلام ضامن ومرزا محمد کاظم علی اور منطق وفلسفہ مولوی ولی اللہ فرنگی محلی لکھنوی سے حاصل فرما کر دستارِ فضیلت وعمامہ عزت باندھا۔ اگرچہ جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ میں بہت زیادہ ماہر تھے مگر علم وادب میں عموماً اور علم حساب میں خصوصاً متبحر تھے اور تا زندگی درس ومذاکرہ میں مشغول رہے اکثر طلباء آپ کے برکتِ درس سے فیضاب ہوئے۔ آپ کی تصنیف میں نسخہ لغایۃ الحساب فی شرح خلاصۃ الحساب مشہور ہے۔ آپ کے علم وفضل کی شہرت چاروں طرف ہوئی۔ فضلائے کرام نے پیشانیِ نیاز اور علمائے اعلام نے غاشیہ اطاعت کندھے پر رکھا۔ آپ کو شاعری سے بھی ذوق تھا۔ شعر پاکیزہ، سنجیدہ اور شیریں ہوتا تھا بعد طے مراحل جملہ اکتساب علوم ملازمت کی طرف مائل ہوئے اور سرکار انگلشیہ میں منصفی کے عہدے پر مامور ہوئے پانچ سال تک شہر جونپور میں منصف رہے بعدہ رہتک ضلع میں تحصیلدار ہوئے۔ اس کے بعد مہاراجہ بنارس کے یہاں دیوانی کے عہدے پر مقرر ہوئے اور ریاست کا تمام کام آپ کے سپرد ہوا اور اس زمانہ میں اودھ کے اندر آپ کا طوطی بولتا تھا۔

دوبار مناسک حج اور زیارت عتبات عالیہ سے مشرف ہوئے بالآخر ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ بمقام بنارس مرض ہیضہ میں انتقال کیا اور قصبہ سادات سونڈہ کجگاؤں میں دفن ہوئے۔

(تذکرہ حصہ دوم صفحہ ۱۱۷ تا ۱۱۹)

تاریخ رحلت یہ ہے ۔

قلت تاریخا لہ فی مصرعہ ☆ نور اللہ الودود مضجعہ ۔۔۔۱۲۹۱ھ

اور لوح سنگِ مرمر پر منجملہ اور اشعار کے یہ مصرع بھی ہے ۔

پنہاں شدہ بزیر زمیں آفتاب دین ۔۔۔ ۱۲۹۱ھ

جب مولانا گلشن علی نے انتقال فرمایا تو مہاراج نے اپنی پگڑی اُتار کر ڈال دی اور زار و قطار روتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ آج دادا جی نے انتقال کیا۔ (یعنی اُن کے والد نے)

پرچہ شیعہ مجموعہ بابت ماہ نومبر ۱۹۱۱ء میں ہے کہ جناب معلی القاب جلالت مآب ہز ہائنس مہاراجہ سر پر بھو نراین سنگھ بہادر جی سی آئی ای والی ریاست بنارس دام اقبالہ، وزاد جلالہ شیعہ کانفرنس منعقدہ بنارس میں تشریف لائے اور تقریر فرمائی تو آپ نے مذہب شیعہ کی بہت تعریف کے بعد فرمایا کہ میرے والد کے دیوان مولانا حاجی سید گلشن علی صاحب مرحوم نے ایک مدت دراز تک اپنے حسن انتظام سے ریاست کو فائدہ پہنچایا ہے اور اُن کے حقوق خدمت بہت زیادہ ہیں۔

سید محمد حسین نوگانوی کا بیان ہے کہ:

''نحیف (میں) نے ۱۳۰۵ھ میں آپ کے فرزند مولوی محمد حسن صاحب کو لکھنؤ میں ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ تقدس و بزرگی آپ کی شان سے ٹپکتی تھی''۔

(تذکرۂ بے بہا، ص ۳۰۵)

مولانا گلشن علی نے دو شادی فرمائیں جن میں سے دوسری شادی میر نجف علی (استاد میر انیسؔ) کی صاحبزادی کلثوم بی بی سے ہوئی تھی۔ اوائل ۱۲۴۶ھ میں مہاراجہ اودت نرائن سنگھ والی ملک بنارس نے مولانا موصوف کی حُسن لیاقت کا شہرہ سن کر سرکار بنارس میں نائب (دیوان جی) کا عہدہ پیش کیا اور دو سو روپے تنخواہ معین کی اور تا آخر نمایاں عہدوں پر فائز رہے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے۔ میر انیسؔ نے ان کے لیے ''تقدس مآب

قبلہ وکعبہ" جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

۲۶ رشعبان ۱۲۸۸ / ھ (۱۰ رنومبر ۱۸۷۱ء) کو میر انیسؔ نے بنارس میں کسی کو ایک سفارشی خط لکھا تھا، یہ خط میر انیسؔ کے مصاحب خاص میر اشرف مسیح کے لئے لکھا گیا تھا اور اس میں ضمنی طور پر خصوصیت کے ساتھ مولوی گلشن علی کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ اس خط کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"جناب میر اشرف مسیح صاحب ولد میر باقر مسیح صاحب مرحوم جو عالی خاندان اور فقیر کے دوستوں میں ہیں اس خط کے وسیلے سے آپ کی خدمت میں تشریف لا رہے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی بیٹی شہر بنارس میں بیاہی گئی تھی۔ اس کے شوہر کی وفات کے بعد سسرال والے اس کو لکھنؤ نہیں آنے دیتے اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان کی زبانی پوری کیفیت اور حالات سماعت فرما کر ان کے حامی اور معین ہوں گے، فقیر کی جانب سے تقدس مآب قبلہ وکعبہ...... مولوی گلشن علی صاحب دام مجدہ...... کی خدمت فیض درجت میں عرض کریں گے کہ جناب والا بھی ان کے ممد و معاون ہوں اور ان کی بیٹی کو سسرال والوں سے مخلصی دلانے میں سعی فرمائیں تو بعید از احسان نہ ہوگا"۔............

(انیسؔ، سوانح، ص ۳۰۴)

حمید صاحب کا بیان تھا کہ:

"میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اس خط کے آتے ہی مولوی گلشن علی کھڑے ہو گئے تھے اور میر صاحب کے حکم کی فوری طور پر تعمیل کی اور کچھ ہی عرصے بعد لکھنؤ جا کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دست بستہ گزارش فرمائی کہ حضور نے کسی دوسرے کے ذریعے سفارش کیوں فرمائی اگر مجھے ہی کہہ دیا ہوتا تو باعث فخر تھا اور پھر یہ بھی فرمایا تھا کہ...... اگر یہ خط آپ کی اپنی تحریر میں میرے نام ہوتا تو میری بخشش کے لیے کافی تھا............"

(جواہر، شمارہ ۲، ۳، ص ۱۰۰)

حمید صاحب کے دادا مولانا حاجی محمد حسن اعلیٰ اللہ مقامہ

چھوٹے لڑکے مولانا سید گلشن علی کے تھے۔ آپ جلیل المرتبت اور مسلم الثبوت عالم تھے۔ خصوصاً علم ریاضی میں یگانہ تھے اور بڑے ہی متقی پرہیزگار تھے۔ ۱۸ر شوال ۱۲۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علوم کتب درسیہ مختصرات ومطولات اپنے والد سے کیا اور تکمیل علوم اکثر علماء عرب وعجم سے بزمانہ حج وزیارت کیا اور علم ریاضی مولوی غلام حسن رتال جونپوری ریاضی داں سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ چونکہ ریاضی کا آپ کو زیادہ شوق تھا اس لئے آپ نے اس علم کی تحقیق کے لئے ۱۲۸۹ھ میں یورپ گئے وہاں کے علماء سے ریاضیات کی مشکلات کو حل کیا۔

آپ کا تقویٰ اتنا زبردست تھا کہ جَو کی خشک روٹی لے کر لندن گئے اور وہاں کے قیام میں بھی اسی خشک روٹی پر بسر کیا۔ اس زمانہ میں آپ حصولِ علم میں اتنا محو تھے کہ اکل و شرب سے بے نیاز تھے۔ آپ کی ذات باعثِ افتخار و باعثِ بقائے علوم جونپور تھی کچھ دنوں تک ضلع جالون و آگرہ میں تحصیلداری کے عہدے پر ممتاز رہے۔ بالآخر ملازمت ترک فرما کر گوشہ نشین ہو گئے اور بنارس کے مہاراجہ سے پنشن پاتے رہے اور رات دن درس وتدریس وتصنیفِ کتب ورسائل اور فکر وذکر اور خدمتِ خلق میں مصروف رہے۔ آپ کی تصانیف بہت زیادہ تھیں۔ مگر کوئی کتاب آپ کی زیادہ مشہور نہ ہو سکی مزار آپ کا کجگاؤں میں ہے۔

(تذکرۂ علماء دوئم ص ۱۲۰)

حمید صاحب کا بیان ہے کہ:

"حاجی سید محمد حسن ۱۸ر شوال ۱۲۴۰ھ کو کجگاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ابتدائی علوم عربیہ اپنے والد سے پائے اور پھر سات برس علوم معقول ومنقول، حدیث وفقہ و ریاضی میں علمائے عراق وایران سے استفادہ کیا۔ ریاضی میں خصوصاً موصوف کی ایجادات

حیرت انگیز تھیں۔ اقلیدس میں کئی اشکال کا اضافہ کیا تھا ایک کتاب خواص اشکال بیضاوی Properties of ellipse پر لکھی تھی اس کے علاوہ ۳۸ کتابیں مختلف علوم پر لکھیں تھیں جن میں سے ۱۷ کا تعلق علوم فقیہ سے تھا۔ یہ کتابیں قلمی حالت میں غیر مطبوعہ، ہمارے گھر کے نادر و نایاب کتاب خانے میں تھیں، جواب نا قدری اقربا کے سبب تلف ہو چکی ہیں۔"

(جواہر، شمارہ ۲، ۳، ص ۱۰۰)

حمید صاحب کے دادا کی مجلسِ چہلم اور اس کا رقعہ

مولانا سید محمد حسن نے پچھتر برس کی عمر میں ۸ رجمادی الاول ۱۳۱۵ھ کو وفات پائی۔ ان کی موت خانوادے کے لیے عظیم صدمہ تھی اس لیے بھی چہلم کی مجلس کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا۔ اس خانوادے کے کیونکہ میر انیسؔ کے خاندان سے دیرینہ مراسم تھے اس لیے طے کیا گیا کہ میر نفیسؔ سے مجلس پڑھوائی جائے۔ اس سلسلے میں حمید صاحب کا بیان ملاحظہ ہو وہ لکھتے ہیں:

"بعدِ وفات ان کے تکیے کے نیچے سے دس ہزار روپے کی کثیر رقم برآمد ہوئی۔ میرے بڑے چچا مولوی رضی الدین اور دیگر بزرگانِ خاندان نے طے کیا کہ مجلس چہلم کے لئے میر خورشید علی نفیسؔ صاحب کو دعوت دی جائے۔ اس کے لئے سید محمد محسن ذوالقدر بہادر جو میر انیسؔ، میر انسؔ اور میر مونسؔ صاحب کو کے شاگرد تھے، ان کا بہت سا غیر مطبوعہ قلمی کلام کراچی میں سید ارتضیٰ عباس سلمہ کے پاس موجود ہے وہ اور نواب میر محمد حسین صاحب (شاگرد میر مونسؔ)، مولوی رضی الدین کے ساتھ میر نفیسؔ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجلس کا وعدہ لیا گیا۔ میر نفیسؔ نے منظور فرمایا۔ چہلم کی تاریخ ۲۵ رجمادی الثانی ۱۳۱۵ھ بروز یکشنبہ طے پائی۔ یہ تاریخ ان کی مجلسِ چہلم کے رقعے سے پتہ چلی ہے۔ یہ بھی قدرت کا معجزہ ہی کہیے کہ یہ رقعہ مجھے سید ارتضیٰ عباس سلمہ نے لا کر دیا اور جب میں نے دیکھا تو میری

حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں ان کی تحقیق اور تلاش کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ ایسی نادر دستاویز ہے کہ اب میرے خاندان میں شاید کسی کے پاس نہیں ہوگی۔ وعدے کے بعد مجلس کی تیاریاں شروع کردی گئیں۔ ہمارے آبائی امام باڑے "حسینیہ مولوی گلشن علی" کو مجلس کیلئے منتخب کیا گیا تھا۔

یہاں صحن سے کچھ آگے ایک کنواں تھا جسے برابر کر کے لکڑی کے پٹرے لگائے گئے تاکہ حاضرین کے راستے میں رکاوٹ نہ بنے، احاطے میں کچھ آم کے قیمتی درخت تھے اُن کو کاٹا گیا تاکہ فرشِ عزا وسیع ہو اور سامعین کی جگہ میں کسی طرح کی کمی نہ رہ جائے۔ عمائدینِ لکھنؤ اس مجلس میں مدعو کئے گئے تھے جن میں چوٹی کے علماء و شعراء، وکلاء، حکماء، رؤسا و احباب وغیرہ شامل تھے۔ مجلس سے چند دن قبل ہی ہمارے عزیز و اقرباء اطراف و جوانب سے آگئے تھے۔ جن لوگوں کو بذریعہ ٹرین آنا تھا ان لیئے اسٹیشن سے لے کر گاؤں لانے تک کا خصوصی اہتمام تھا۔ کھانے کے لیے لکھنؤ سے خصوصی باورچی بلوائے گئے تھے۔ مجلس سے ایک دن قبل ۲۴ رجمادی الثانی کو میر نفیسؔ مرحوم لکھنؤ سے مع احباب تشریف لے آئے تھے۔ ان کی خاطر و مدارات میں غیر معمولی انتظامات کئے گئے تھے۔

میرے والدِ مرحوم سید محمد حیدر اس وقت ۸ برس کے تھے وہ بتاتے تھے کہ جب میر نفیسؔ کی خدمت میں بالائی پیش کی گئی۔ اسے تناول فرمانے میں بھی وہ اس قدر نفیس تھے کہ کچھ دیر بالائی منہ میں رکھ کر چوسی پھر اُگال دان میں ڈال دی۔ اللہ اللہ کیسے لوگ تھے۔ اب ایسے نفیس اور ماہرانِ فن کہاں پیدا ہوں گے۔ ۲۵ رجمادی الثانی ۱۳۱۵ھ کی صبح ۸ بجے مجلس کا وقت مقرر تھا۔ پہلے ہی سے امام باڑہ حاضرین سے بھر گیا تھا۔ لکھنؤ کے تمام جید علماء شریکِ مجلس تھے۔ شعراء و رؤسا کی بھی بڑی تعداد تھی۔ میں نے اپنے عم محترم مولوی سید رضی الدین مرحوم کی ذاتی بیاض میں اس مجلس کے مصارف کی تفصیل دیکھی تھی جو قریب ۲۵ ہزار روپے پر مشتمل تھی۔ جس سے اس مجلس کے انتظامات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پہلے مختصر

پیش خوانی ہوئی، پھر میر نفیسؔ رونق افروز منبر ہوئے پہلے چند رباعیات اور پھر سلام پڑھا اس کے بعد اپنا مندرجہ ذیل مرثیہ پڑھا:

فراغ ماہ کو جب رات کے سفر سے ہوا

یہ مرثیہ حضرت عباسؑ کے حالات پر مشتمل ہے اور کیونکہ اس وقت میرے دادا مرحوم کے بھائی حیات تھے اسی مناسبت سے حضرت عباسؑ کے حال کا انتخاب کیا گیا ہوگا۔ جس منبر پر یہ مرثیہ پڑھا گیا تھا وہ آج بھی حسینیہ گلشن علی میں موجود ہے۔ میرے خاندان کے بزرگ اس مجلس کی خواندگی کے بارے میں بتاتے تھے کاش آج وہ ہوتے تو بہت سی نئی باتیں ان سے معلوم ہو جاتیں۔ اس مرثیے کا ایک بند ایسا ہے جو میرے گاؤں کے ایک بزرگ سید خوشنود حسن خاں بہت سناتے تھے۔ وہ بند یہ ہے:

بس اب ہے ختم وغا اور یہ کارزار یہ رنگ　　دکھا چکا قلم منقبت نگار یہ رنگ
رہے گا آج کی مجلس کا یادگار یہ رنگ　　پسند کرتے ہیں سب میرے دوستدار یہ رنگ

نہ طول بزم میں وقت بیان جنگ دیا
نفیسؔ خوب ترے مرثیے نے رنگ دیا

(جواہر اشعار، ج ۳، ص ۱۰۱۔ ۱۰۲)

میرے کتب خانے میں مجالس کے قدیم اشتہارات کا ایک بڑا ذخیرہ بھی موجود ہے۔ جس میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک دن جب حمید صاحب نے مجھے اپنے دادا کے چہلم کی مجلس کا حال سنایا تو مجھے یاد آیا کہ میرے پاس میر نفیسؔ کی ایک مجلس کا اشتہار ہے اور وہ بھی جونپور ہی کا ہے میں نے ان کے دادا کا نام لکھ لیا جب گھر آیا تو اس رقعے کو تلاش کیا، میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ وہ حمید صاحب کے دادا ہی کا اشتہار تھا صبح ہوتے ہی میں ان کے گھر گیا اور وہ رقعہ دکھایا تو وہ حیران رہ گئے۔ سارے گھر والوں نے رقعہ دیکھا وہ آج بھی گواہی دیں گے کہ حمید صاحب کتنے خوش تھے۔ اس رقعہ کا عکس اگلے صفحے پر دیکھیے۔

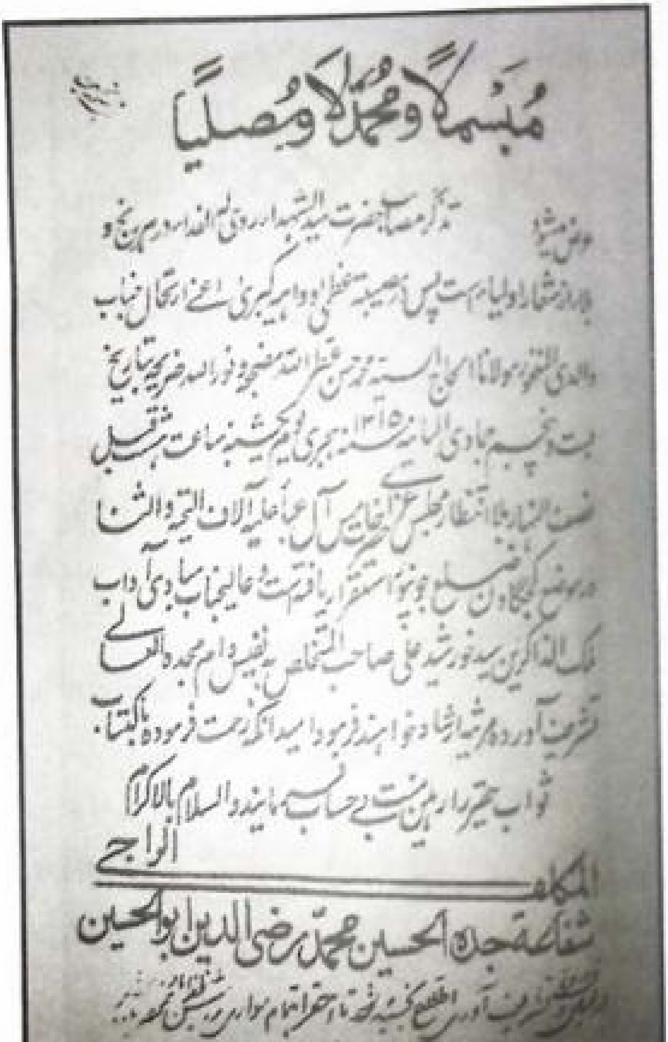

مُبَسمِلاً و مُحمِّداً و مُصلّیاً

تذکرہ مصائب حضرت سید الشہداء روحی لہ الفداء موجب رنج و [illegible]

[illegible] پس بمصیبت عظمیٰ و داہیہ کبریٰ ارتحال جناب

والدی المغفور مولانا الحاج السید محمد حسن [illegible] بتاریخ

بست و پنجم جمادی الثانیہ ۱۳۱۵ ہجری یوم یکشنبہ ساعت [illegible]

[illegible] مجلس [illegible] آل عبا علیہ الالف التحیۃ والثنا

[illegible] عالیجناب [illegible]

[illegible] سید خورشید علی صاحب المتخلص بہ نفیس دام مجدہ العالی

تشریف آوردہ [illegible] خواہند فرمود امید کہ زحمت فرمودہ [illegible]

ثواب [illegible] بی حساب [illegible] والسلام بالاکرام

الراجی

المکلف

شفاعۃ جدہ الحسین محمد رضی الدین ابو الحسین

[illegible]

حمید صاحب کے دادا کی مجلس چہلم کا رقعہ

حمید صاحب کے چچا مولانا سید رضی الدین اعلی اللہ مقامہ

مولانا سید محمد حسن کے سب سے بڑے فرزند مولانا سید محمد رضی الدین بھی بڑے ذہین اور ذکی الطبع تھے۔ ۱۱ر محرم ۱۲۷۱ھ کو ولادت ہوئی۔ تعلیم اپنے والد اور جد امجد سے پائی تھی اور احادیث اور فقہ کے بڑے عالم تھے۔ دس ہزار حدیثیں نوک زباں تھیں۔ چھ سال عراق میں رہ کے علوم حدیث وفقہ کی تکمیل کی اور اجازۂ اجتہاد حاصل کیا۔ موصوف چوٹی کے مقررین میں شمار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں چالیس مجلسیں انا انزلنٰہ کی تفسیر پر پڑھیں تھیں جو سالہا سال یادگار رہیں۔ ذاکری کا پیشہ نہیں اختیار کیا نہ کبھی کوئی معاوضہ یا نذرانہ اس کام کے لئے قبول کیا۔ ان مجلسوں میں مجمع کا اندازہ دس بارہ ہزار کا تھا۔ باوجود وسعت امام باڑہ میں کھڑے ہونے کی جگہ بھی سامعین کو مشکل سے ملتی تھی۔ موصوف بنگال کے محکمہ تعلیم میں ملازم تھے لیکن اپنے کام سے دلچسپی کم تھی پچیس سال کی ملازمت میں نصف کے قریب رخصت پر رہے اور آخر میں قلیل پنشن پر علیحدہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ امام باڑہ ہگلی کے متولی بھی رہے لیکن بعض امور کے غیر مشروع ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ سے اختلاف پیدا ہوا اور وہاں سے بھی علیحدہ ہو گئے۔ اپنی دوران ملازمت میں مرشد آباد میں ایک شیعہ یتیم خانہ اور ایک عربی اسکول قائم کیا جسے بہت فروغ ہوا۔

زندگی کا آخری حصہ کربلائے معلی میں بسر ہوا۔ ۱۸۸۸ء کے سفر نامۂ زیارات ''سلوک الزائرین'' میں ان کا ذکر ہندوستانی علماء کی فہرست میں موجود ہے۔ ۵ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو کربلا میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

اپنے چچا سے متعلق حمید صاحب کا بیان ہے کہ:

''مولوی رضی الدین کے بارے میں بھی چند باتیں سن لیجئے۔ اُن جیسا باکمال واعلم ہمارے پورے خاندان میں نہ ہوا۔ آپ ۱۹ برس تک نجف اشرف میں علوم مختلفہ کی تحصیل کرتے رہے۔ شیخ الصدر نے انھیں جو اجازہ مرحمت فرمایا تھا کہ اس میں خصوصیت کے ساتھ

لکھا تھا کہ میرے پاس جس قدر علم تھا وہ میں نے انھیں دقاً دقاً پڑھا دیا ہے اب یہ علم کی اُس منزل پر ہیں کہ مجھے پڑھائیں۔ حامدؔ صاحب کا بچپن مولوی رضی الدین ہی کے ساتھ گزرا تھا وہ بچپن میں ان کے کانوں میں مسلسل آیاتِ قرآنی اور احادیثِ پیغمبرو آئمہؑ پڑھا کرتے تھے جو جناب امیرؑ کی شان میں وارد ہوئی ہیں۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ جب حامدؔ صاحب نے مرثیہ گوئی شروع کی تو اپنے مراثی میں جگہ جگہ آیاتِ قرانی اور حادیث کو نظم فرمایا۔"

(مراثی حامدؔ، ص ۲۲، طبع جدید، کراچی)

حمید صاحب کے والد مولانا سید محمد حیدر مرحوم

۱۵ ربیع الثانی ۱۲۹۵ھ کو کجگاؤں میں ولادت ہوئی۔ اوائل عمر میں مرادآباد میں پولیس ٹریننگ لے کے اُس محکمہ میں ملازم رہے کچھ عرصہ یو پی گورنمنٹ میں اور چند سال بنارس راج میں رہے۔ اس کے بعد ملازمت کے غیر مشروع ہونے کی وجہ سے قابل پینشن پر علیحدہ ہوگئے۔ اپنے بزرگوں کی طرح آپ نے بھی عراق میں علم کی تحصیل کی اور وہاں کے علماء سے اجازۂ اجتہاد حاصل کیا۔ ۱۹۵۷ء میں وفات ہوئی۔

حمید صاحب کے حالاتِ زندگی

ولادت اور بچپن

حمید صاحب ۴ر نومبر ۱۹۲۸ء کو جونپور کے مشہور گاؤں "کجگاؤں" میں پیدا ہوئے۔ اسی دن سید علی مصطفیٰ جونپوری کی بھی ولادت ہوئی تھی، جنہوں نے ۲۷ برس کی عمر پائی۔ مشاق شاعر تھے۔ مرثیے بھی کہتے تھے۔ سید یداللہ حیدر نے ان کا تمام کلام "شعرستانِ مصطفیٰ" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

حمید صاحب کی والدہ افضل النساء بی بی کا تعلق محمد آباد سے تھا۔ اس لئے جونپور اور محمد

آباد کی ملی جلی تہذیب کے درمیان تربیت ہوئی۔ گھر کا ماحول خالصتاً مذہبی تھا ان کی پھوپھیاں تک اپنے والد کو عربی اور فارسی میں خطوط لکھتی تھیں۔ اس لئے ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھائی گئیں۔

انھوں نے مجھے اپنے بچپن کے بہت سے واقعات سنائے تھے۔ خاص طور پر گاؤں کا محرم بہت بارونق ہوتا تھا۔ ذاکری نہ ہونے کے برابر تھی صرف تحت اللفظ مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ مولوی سبطِ حسن صاحب قبلہ کا زمانہ تھا۔ ان دنوں لکھنؤ میں ان کی ایک مجلس کے بہت چرچے ہوئے جس میں انھوں نے دورانِ مجلس پانی طلب کیا، زیادہ ہونے کے باعث پانی چھلک گیا اور نیچے موجود ایک صاحب کی پشت پر گرا۔ مجلس کی پوری توجہ اسی جانب تھی سامعین نے اس بات کو محسوس کیا، توجہ مجلس سے ہٹ رہی تھی سبطِ حسن صاحب قبلہ نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اسی وقت پانی کا جام منبر پر رکھا اور کہا کہ ''اسی پانی کے لیے میرے مولا ترس گئے۔'' مجلس اُلٹ گئی اور شدید گریہ ہو۔ اسی گوشے سے منطبق کرتے ہوئے مصائب ختم ہوئے۔ لجگاؤں کے ایک صاحب مجلس پڑھتے تھے وہ بھی اسی مجلس میں تھے۔ انھوں نے یہ منظر دیکھا۔ جب گاؤں آئے تو ایک مجلس میں جان کر بعینہ یہی حرکت فرمائی اور نیچے بیٹھے ہوئے صاحب پر پانی گرایا، جن صاحب پر پانی گرا تھا انھوں نے کہا ''کیا بکواس ہے یہ، کیا کر رہے ہو؟'' انھوں نے منبر سے کہا ''چپ رہیے میں مصائب پڑھ رہا ہوں۔'' حمید صاحب مجلس میں موجود تھے کہتے تھے کہ یہ مجلس بچپن کے ساتھیوں کو سالوں تک یاد رہی۔

اسی طرح ایک بزرگ میر انیس کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ پڑھت میں اس قدر محتاط تھے کہ جو لکھا ہوتا تھا وہی پڑھتے تھے چاہے غلط ہی کیوں نہ ہو۔۔۔۔ میر صاحب کا مرثیہ نکالا اور پہلا مصرعہ یوں پڑھا!

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غزاپ سے

جب قہقہہ لگا تو معلوم ہوا کسی نے نکتے لگا دیے تھے۔ اسی طرح کی کارفرمائی ایک مرثیہ خوان کے بستے میں اور ہوئی۔ انھوں نے جبرئیل کو "جرنیل" پڑھا تھا۔

مہاراجہ بنارس سے ان کے خاندانی مراسم کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ ان کے بچپن کا واقعہ ہے ان کے والد مولوی محمد حیدر انھیں مہاراجہ بنارس کے پاس لے گئے۔ اس وقت کی تہذیب کے مطابق انھوں نے ان کے ہاتھ میں دس آنے کا سکہ دیا اور کہا کہ جب مہاراج کو سلام کرنا تو ہتھیلی بڑھا کر سکہ پیش کرنا وہ صرف ہاتھ رکھیں گے اور ہٹا لیں گے۔ حسب دستور حاضری ہوئی۔ مہاراجہ نے سکہ پر ہاتھ رکھ کر ہٹا لیا۔ کچھ دیر تک باتیں رہیں جب وہاں سے نکلے تو بچپن کی چالاکی اپنے عروج پر آئی اور وہ دس آنے دیسی مرغی، برفی اور بالائی کی نذر ہو گئے۔

سلطان المدارس میں داخلہ

سات برس کی عمر ہوئی تو دینی تعلیم کی تحصیل کے لیے سلطان المدارس (لکھنؤ) میں داخلہ کرایا گیا۔ جہاں وہ چودہ برس تک زیرِ تعلیم رہے۔ اس زمانے میں نادرۃ الزمن مولوی ابنِ حسن صاحب نونہروی پرنسپل تھے۔ وہ مدرسہ کے شباب کا زمانہ تھا۔ اس عہد کے جید علماء وہاں پڑھاتے تھے۔ حمید صاحب نے مندرجہ ذیل علماء سے کسبِ فیض کیا۔

۱۔ مولوی سید احمد صاحب قبلہ۔ جن کی اشاروں والی ذاکری مشہور تھی۔ لڑکپن کی اکثر مجالس میں ان کے ساتھ جاتے تھے۔

۲۔ مولوی ابنِ حسن نونہروی صاحب، شرح لمعہ تک ان سے پڑھا۔ اس کے علاوہ میر انیسؔ کے مرثیے بھی ان ہی سے پڑھے۔

۳۔ مولانا محمد مصطفیٰ جوہرؔ، دیوان ناصر علی کی مسجد میں ان کا قیام تھا۔ ڈاکٹر علی زیغی نے عربی ادب پر دو کتابیں لکھی تھیں وہ دونوں مولانا محمد مصطفیٰ صاحب جوہرؔ سے پڑھیں اس وقت علامہ طالب جوہری کا بچپن تھا۔

۴۔ مولوی سید محمد عادل رضوی، کچھ کتابیں ان سے پڑھیں۔

ہم جماعت اور ہم عصر طلباء

حمید صاحب کی طالب علمی کے دور میں جو طلباء سلطان المدارس میں زیرِ تعلیم تھے انھوں نے اپنے وقت میں خوب خوب نام پیدا کیا۔ مولانا مرتضیٰ حسین صدر الافاضل کی جوانی تھی وہ حمید صاحب کے بزرگ طبقے میں تھے۔ اسی طرح مولانا سبط الحسن فاضل ہنسوی وغیرہ کی جوانی دیکھی تھی۔

ہم جماعت طبقے میں حسین محمد جعفری صاحب (جو حیات ہیں اور ان کی کتاب ''تاریخ تشیع'' نے بہت شہرت پائی)، عزت الزماں عزت لکھنوی، سخن فتحپوری، مولانا حامد حسین امروہوی شامل تھے جن سب نے پاکستان آ کر اپنے اپنے شعبے میں خدمات انجام دیں اور شہرت بھی پائی۔

ان سے کمسن طبقے میں مولانا مرزا محمد اطہر مرحوم اور ان کے ہم عمر طلباء تھے جن کا تذکرہ اکثر آتا تھا۔ یقیناً ان میں سے اب بھی کچھ لوگ لکھنؤ میں زندہ ہوں گے۔

جن علماء کو حمید صاحب نے دیکھا

حمید صاحب کے والد مولوی محمد حیدر صاحب سے لکھنؤ کے تمام علماء کے مراسم تھے اس لیے حمید صاحب پر سب کی نظرِ خاص بھی تھی اور توجہ بھی اس وجہ سے اساتذہ سے بے تکلف تھے لیکن احترامات کے ساتھ۔

مولوی ابنِ حسن نونہروی مرحوم سے انھوں نے مدرسی تعلیم کے علاوہ میر انیسؔ کے بعض چیدہ مرثیے بھی پڑھے۔ انھیں اکثر چائے بنا کر دینا ان کی ذمہ داری بھی تھی۔ ان کی جوتیاں سیدھی کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے اس زمانے میں علامہ رشید ترابی تین مجالس پڑھنے کے لیے لکھنؤ آئے۔ رقعے میں ان کا نام ''رضا حسین دکنی'' شائع ہوا تھا۔ یعنی یہ ترابی صاحب کے عروج خطابت سے پہلے کی بات ہے۔ حمید صاحب نے ان مجالس میں شرکت کی۔ یہ

مجالس بے حد مقبول اور تاریخی ہوئیں۔ ایک دن ابنِ حسن صاحب نونہروی سے آ کر کہا کہ "حضور آپ تو وہی گھسا پٹا خطبہ پڑھتے ہیں۔" (یہ مزاحاً کہا تھا) انھوں نے کہا کیوں کیا ہو گیا؟ انھوں نے کہا صاحب، ایک ذاکر دکن سے تشریف لائے ہیں، کیا خطابت ہے ان کی، سب کچھ "نہج البلاغہ" سے پڑھا اور خوب پڑھا۔ یہ سن کر ابنِ حسن صاحب نونہروی نے کہا "میاں وہ "نہج البلاغہ" پڑھتے ہیں اور میں پڑھاتا ہوں۔"

جناب ناصر الملت والدین سید ناصر حسین موسوی عبقاتی کی مجلسِ چہلم ابنِ حسن صاحب نے پڑھی تھی۔ حمید صاحب اس میں بھی شریک تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ابنِ حسن صاحب نے جید علماء کی کتابوں کا ذکر کیا، اس کے بعد علامہ مجلسی کی "بحار الانوار" کا ذکر کرتے ہوئے اس کی خصوصیات بیان کیں اور پھر "عبقات الانوار" کا موازنہ کیا اور اس کی انفرادیت بیان کی۔ لکھنؤ اور اطراف واکناف کے تمام علماء موجود تھے۔ ایسی تاریخی مجلس ہوئی کہ لوگوں کو سالوں یاد رہی۔ ابن حسن صاحب عام طور پر اچکن یا قبا اور عمامے میں مجلس پڑھتے تھے لیکن اس دن مکمل عالمانہ لباس میں تھے۔

بچپن میں سبطِ حسن صاحب قبلہ کی ذاکری بھی سنی، کمن صاحب قبلہ کو بار بار سنا۔ کہتے تھے کہ اُن کا بیان انتہائی سادہ اور دلفریب ہوتا تھا۔ جس طرز میں فضائل ہوتے تھے اسی میں مصائب۔ آواز اور لہجہ یکساں رہتا تھا۔ آدھے گھنٹے کے فضائل اور اتنے ہی مصائب ہوتے تھے۔

مولوی عبدالحسین صاحب مرحوم کو دیکھا تھا۔ جو اسوقت سلطان المدارس میں معلّم تھے۔ جناب ناصر الملت کے بعض مواعظ میں شرکت کی تھی۔ جو مسجدِ کوفہ (لکھنؤ) میں بیان ہوتے تھے۔

قاری تمنچہ کی ذاکری کے بڑے چرچے تھے۔ ان کو تمنچہ کہنے کی وجہ یہ تھی کہ آرام سے بولتے بولتے ایک دم سے تیز ہو جاتے تھے۔ جیسے پستول سے گولی نکلنے کی آواز ہو، ان

کی ایک مجلس میں ابنِ حسن صاحب نونہروی نے بھی شرکت کی۔ حمید صاحب ساتھ تھے۔ مجلس کسی خاتون کے سوئم کی تھی۔ مجلس میں ایک مقام ایسا آیا جس پر ابنِ حسن صاحب سے برداشت نہ ہوسکا تو انہوں نے رومال منہ پر رکھ لیا۔ یہ انداز اتنا محتاط تھا کہ کسی نے محسوس تک نہ کیا۔ مجلس کے بعد جب مدرسہ پہنچے تو حمید صاحب نے پوچھا! ''حضور! آپ نے دورانِ مجلس چہرے پر رومال کیوں رکھ لیا تھا؟'' تو کہنے لگے! ''تم نے سنا نہیں تھا کہ قاری تیچپے نے کیا جملہ کہا تھا؟'' میری ہنسی نہ رُک سکی۔۔۔۔ انھوں نے کہا۔۔۔۔۔ ''اے اہلِ عزا، مرحومہ کے والدِ مرحوم سے پوچھیے ان پر کیا گزر رہی ہوگی۔''

ایک بار مدرسے کے لڑکوں کے ساتھ شب برات کا شربت بنا رہے تھے۔ لیموں کا شربت تھا۔ ایک طرف لیموں دھرے تھے دوسری طرف شربت تیار ہو رہا تھا۔ ابنِ حسن صاحب نونہروی گزرے۔ بھئی میاں حمید کیا کر رہے ہو؟ حضور، شربت تیار ہو رہا ہے۔ ابنِ حسن صاحب نے ایک نظر دیکھا اور فی البدیہہ شعر پڑھا اور چلے گئے، لڑکے قہقہے لگاتے رہ گئے۔ شعر یہ تھا!

آئی شب برات چھچھوندر کو چھوڑ دو
بِلّی کی ناک کاٹ کے لیموں نچوڑ دو

مولانا محمد عادل رضوی سے بھی بے حد قربت تھی۔ ان کے دو بیٹوں کے نام فاضل رضوی اور عاقل رضوی تھے۔ ایک روز ان کی خدمت میں گئے تو مولانا عادل رضوی مرحوم نے کہا'' میاں حمید، تمہارا ایک اور بھائی اس دنیا میں آیا ہے، میرے گھر میں ولادت ہوئی ہے''، حمید صاحب نے کہا حضور! نام کیا تجویز ہوا۔ انھوں نے کہا'' محمد واصل'' یہ بولے، حضور مبارک ہو، برفی کب ملے گی؟ انھوں نے کہا فکر مت کرو، مل جائے گی، یہاں ان کی رگِ ظرافت پھڑکی، طبیعت تو موزوں تھی ہی، ذہین بھی تھے، فوراً کہا، حضور! ولادت کی تاریخ کا ایک شعر ہوگیا ہے، کہیں تو عرض کروں؟ انھوں نے کہا، ارے واہ، ماشاء اللہ ماشاء

اللہ، سناؤ۔۔۔۔!

کاغذ پر شعر لکھ کر دیا۔

بھاگنے کی تیاری انھوں نے پہلے ہی کر لی تھی، شعر یہ تھا۔۔

عادل و عاقل و فاضل

کُلُّ جہنم واصل

مولانا عادل صاحب غصے کے عالم میں اُٹھے، جوتی ہاتھ میں اُٹھائی ارے کمینے، حمید صاحب نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نکل لیے اور پھر بھی خوف اس قدر تھا کہ مدرسے سے نکل کر سامنے کنگ جارج میڈیکل کالج تھا اسے بھی پار کر کے دوسری طرف نکل گئے۔

مولانا ابنِ حسن نونہروی اپنے کمرے سے نکل رہے تھے انھوں نے انھیں بھاگتے ہوئے دیکھا اور مولانا عادل رضوی کو غصہ میں دیکھ کر وجہ پوچھی، انھوں نے شعر سنا دیا، جس پر مولانا ابن حسن نونہروی بھی محظوظ ہوئے اور کہا کہ اس کی ذہانت بھی تو دیکھو، سارے نام ایک شعر میں جمع کر دیے ہیں۔

مولانا مرحوم کے فرزند سید محمد واصل رضوی اس وقت بحمد اللہ حیات ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں اور ہمارے احباب میں ہیں۔ مجھے امید ہے وہ اس واقعہ کو پڑھ کر بالکل برا نہ مانیں گے۔ کیوں کہ سلف کی یادگاریں ہیں اور حمید صاحب خود بھی یہ شعر انھیں سنا چکے ہیں۔

عادات و اطوار

ظرافت اور مزاح ان کے خمیر میں تھا، دوستوں کے دوست تھے، گھر میں بھی اپنی دختر اور نواسوں سے مذاق رہتا تھا۔ گھر کی رونق تھے۔ ان کے تقریباً سارے دوست ان کی زندگی میں مر گئے تھے۔ میں نے صرف چند کو دیکھا ایک رمضان علی صاحب مرحوم (خوجہ) دوسرے مظاہر حسین، سید حسین محمد جعفری جن کی کتاب ''تاریخ تشیع'' بہت مقبول ہوئی، ایک روز میں اور حمید صاحب ان سے ملنے گئے تھے، پرانی باتیں نکل آئیں، یادگار

ملاقات رہی۔

چینی کھانے ان کی مرغوب غذا تھی۔ خود کھانے سے زیادہ دوسروں کو کھلا کر خوش ہونا ان کی عادت تھی، خوش پوشاک شروع سے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں آغا باقر سے شیروانی سلتی تھی جس کی دکان تحسین کی مسجد کے سامنے تھی۔ اس کا کمال یہ تھا کہ صرف بالشت کے اندازے سے شیروانی تیار کر دیتا تھا۔ اسی طرح عمدہ چکن کے کڑھے ہوئے کُرتے اور پاجامے زیب تن ہوتے تھے۔

حقے کے بے انتہا شوقین، جسے بعد میں ترک کر دیا تھا لیکن تمبا کو بہت کثرت سے استعمال کرتے تھے اور وہ بھی اتنا نفیس ہوتا تھا کہ پورا کمرہ مہک اُٹھتا تھا۔ دو تین تمبا کوؤں کو ملا کر استعمال کرتے تھے۔

مرثیوں کا ذوق

مرثیوں سے غیر معمولی شغف تھا۔ میر انیسؔ کے بند زبانی یاد تھے۔ اکثر گھنٹوں ان موضوعات پر باتیں رہتی تھیں۔ سلاموں کے اشعار اور رباعیاں بھی زیرِ بحث رہتی تھیں۔ وہ محرم میں جونپور میں مرثیے بھی پڑھا کرتے تھے خاص طور پر جب ذوالجناح کا جلوس ہوتا تھا اور ذوالجناح گھر پر آتا تھا تو تعشق کا مرثیہ پڑھا جاتا تھا۔ جس کا درمیانی مطلع یہ تھا:

اے ذوالفقار جلوہ نمائی کا وقت ہے

اپنے گھر میں ملاقات کے کمرے میں غالبؔ کی بڑی سی تصویر لگائی ہوئی تھی۔ ایک دن مجھ سے کہا کہ مجھے میر انیسؔ کی صاف اور واضح تصویر چاہیے ہے تاکہ فریم کرا کے غالبؔ کے برابر میں لگاؤں۔ میں نے اسی سائز کی ایک بڑی تصویر بنوا کر دے دی جو آج بھی ان کے کمرے میں آویزاں ہے اس پر میر انیسؔ کا ایک شعر لکھوا دیا تھا جو انہیں بہت پسند تھا!

خاک کو ہے خاک سے اُلفت تڑپتا ہوں انیسؔ
کربلا کے واسطے میں، کربلا میرے لیے

انیسؔ، دبیرؔ، انسؔ، مونسؔ، محسنؔ ذوالقدر جونپوری، وحیدؔ، نفیسؔ، حامد جونپوری وغیرہ کے مرثیے پڑھے ہوئے تھے اور متعدد بند حفظ تھے۔ انھوں نے لکھنؤ میں جوشؔ صاحب اور نسیمؔ امروہوی کے مرثیے ان کی زبانی سُنے تھے۔ خبیر لکھنوی، مودب ومہذب لکھنوی کو بھی سنا تھا۔

اصفہانی کمپنی میں ملازمت اور پاکستان آمد

حمید صاحب جیسے لوگ بہت کم دیکھے ہیں۔ ان کی تعلیم اگرچہ مذہبی تھی لیکن انھوں نے اس راہ کو اختیار نہ کیا بلکہ گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے ملازمت کرنے کا ارادہ کرلیا۔ دنیاوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اصفہانی کمپنی (ڈھاکہ) میں ملازمت کرلی۔ یہ Jute کی مشہور کمپنی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے کلکتہ کا بھی سفر کیا تھا اور وہاں کئی دنوں قیام کیا۔ اس دوران وہ کراچی بھی آتے جاتے رہے۔ ملازمت کے وقت ان کی عمر ۱۹ سال تھی۔ ۱۹۵۱ء میں ملازمت شروع کی۔ اس دوران ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۲ء میں کراچی بھی آئے۔ ڈھاکہ کے سقوط کے بعد ۱۹۷۱ء میں کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ کچھ خاندان والے پہلے ہی کراچی آکر آباد ہو گئے تھے جن میں کرارؔ جونپوری کا خاندان بھی تھا۔ یہاں کراچی کی معروف بستی ''رضویہ سوسائٹی'' میں قیام ہوا اور تادم آخر یہیں رہے۔

کراچی میں انھوں نے طباعت کا کام شروع کیا۔ کراچی کے مشہور بینکوں کا طباعتی کام ان کے پاس تھا اور اس کاروبار میں انھوں نے خوب ترقی کی اور رضویہ سوسائٹی F-29/A میں اپنا ذاتی گھر بنایا۔

حسینیہ، پنجتن کی بنیاد رکھنا

حمید صاحب نے کھلنا میں ملازمت کے دوران ''حسینیہ پنجتن'' کی بنیاد بھی رکھی۔ ان کے ایک دوست نے امام باڑے کے لیے زمین نذر کی تھی جس کی تعمیر کے لیے کل سرمایہ حمید صاحب نے جمع کیا۔ ان کے دیگر احباب بھی اس میں شامل تھے۔ ارادہ یہ تھا کہ پہلے امام باڑے کی عمارت بنے لیکن حمید صاحب نے مشورہ دیا کہ سب سے پہلے دکانیں بنیں گی ان

کو کرائے پر اٹھایا جائے گا اور اس کی آمدنی سے امام باڑہ تعمیر ہوگا تاکہ مستقبل میں معاشی مسائل پیدا نہ ہوں۔ سب نے اس تجویز کو پسند کیا اور حمید صاحب نے اپنی نگرانی میں تعمیراتی کام کرائے۔ یہ امام باڑہ آج بھی موجود ہے اور کھلنا (ڈھاکہ) کے مرکزی امام باڑوں میں شمار ہوتا ہے۔

میری حمید صاحب سے پہلی ملاقات

کراچی کی قدیم بستی ''رضویہ کالونی'' پاکستان سے عمر میں ۸ دن چھوٹی ہے کیوں کہ اس کے قیام کی تاریخ ۲۲ راگست ۱۹۴۷ء ہے۔ یہاں ہندوستان سے آ کر ایسی عظیم شخصیت نے قیام کیا تھا کہ یہ بستی ہندوستانی تہذیب کا ایک استعارہ بن گئی تھی۔ نجم آفندی، نیاز فتحپوری، حامد لکھنوی، موجد سرسوی، سید ضیاء الحسن موسوی، مولوی سید حسین رضوی، مولانا محمد باقر شمس لکھنوی، حکیم محمد باقر لکھنوی، آغا سلطان مرزا وغیرہ جیسی شخصیات کا یہاں قیام رہا۔ قومیات کی شخصیات اس کے علاوہ ہیں۔ دیگر علماء اس کے علاوہ ہیں۔ مولوی محمد عادل رضوی یہاں پیش نماز تھے۔ اسی عہد کی یادگاروں میں ایک تہذیبی شخصیت سید ماجد حسین رضوی مرحوم کی تھی وہ اس بستی کی آخری تہذیبی یادگار رہے تھے۔ ان کا مکان E-43 ارباب شعروادب کے لیے کھلا رہتا تھا اور صبح، شام اور رات نشستیں ہوتی تھیں۔ شہر کا کون سا بڑا شاعر اور عالم ہوگا جو یہاں نہ آیا ہو۔ حاضرین میں، میں سب سے کم تھا۔ میری زندگی کے دس برس یہاں گزرے۔

حمید صاحب یہاں پابندی سے جاتے تھے۔ ایک شام میں ماجد صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر تھا کہ اچانک سیاہ شیروانی اور علی گڑھی پاجامے میں، نقرئی سلیم شاہی پہنے ایک صاحب وارد ہوئے، منہ میں پان تھا، ماجد صاحب استقبال کو کھڑے ہوگئے، اپنے قریب بٹھایا، شعروادب کی باتیں ہوتی رہیں۔ انیس کا ذکر آیا ماجد صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ اس زمانے میں میری پہلی کتاب ''سوانح حضرت اُمّ سلمہؓ'' شائع ہوگئی تھی۔ حمید

صاحب نے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا اور مجھے اپنے گھر ملاقات کی دعوت دی۔ میں اگلے دن ہی حاضر ہوا۔ کتاب پیش کی۔ انیس کا ذکر نکل آیا انھوں نے مرثیوں کے بند سنانا شروع کر دیے۔ کچھ دیر بعد اندر گئے اور میر انیس کا ایک قلمی مرثیہ لے آئے جو ۱۲۵۷ھ کا لکھا ہوا تھا اور مجھ سے کہا کہ میں نے اپنے آبائی کتب خانے سے کچھ نہیں لیا صرف صرۂ خاکِ شفا (امام حسین کی اصل قبر مبارک کی مٹی جوان کے بڑے چچا مولوی رضی الدین جونپوری، مدفون کربلائے معلی، خود لے کر آئے تھے) اور یہ قلمی مرثیہ۔ اس کا مطلع تھا!

''کیا فوجِ حسینی کے جوانانِ حسیں تھے''

پھر انھوں نے اپنا خاندانی پس منظر بتایا۔ تا دیر گفتگو ہوئی۔ وہ اس دن مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ یہ ۲۰۰۴ء کی بات ہے۔ یہ مراسم پندرہ برس تک برقرار رہے۔

خاندانی کتب خانہ

یہاں حمید صاحب کے آبائی کتب خانے کا ذکر بہت ضروری ہے۔ یہ بے نظیر کتب خانہ ۱۶ طویل الماریوں پر مشتمل تھا جو چھت تک تھیں۔ مولوی گلشن علی نے سفرِ زیارت کے دوران بہت سی اہم کتابیں خریدی تھیں جو اس میں محفوظ تھیں۔

سید محمد حسین نوگانوی لکھتے ہیں:

''۱۲۶۰ھ میں پہلا سفرِ زیارات عتبات عالیات عراق و حج بیت اللہ الحرام و زیارات چہاردہ معصومین علیہم السلام سے مشرف ہو کر ۱۲۶۷ھ میں مراجعت فرمائی جس کی تاریخ (بخیریت آمد) ہے اس سفر میں حاکم حدیدہ نے طب اور شریف مدینہ نے ایک سال تک ادبیات آپ سے حاصل کیے اور علمائے اعلام پر ایران و عراق سے برابر مکالمات و مناظرات علومِ دینیہ میں رہے اور سب نے علمی کمالات کو آپ کے مان لیا اور صدہا کتب دینیہ اس سفر میں خریدیں۔''

(تذکرۂ بے بہا، ص ۳۰۴)

سید محمد جعفر لکھتے ہیں:

”یہ کتب خانہ اس قدر بیش بہا تھا کہ اگر مصر اور یورپ میں فروخت کیا جاتا تو لاکھوں پونڈ قیمت آسکتی تھی۔“

(نسب نامہ، سادات جونپور)

حمید صاحب کا بیان ہے کہ:

”اس کتب خانے میں ایسی عمدہ اور نایاب قلمی کتابوں کا ذخیرہ تھا کہ حضرت مولانا مصطفیٰ جوہر مرحوم لکھنؤ سے تعطیلات کے ایام میں ہمارے یہاں آ کر ٹھہرتے تھے اور بہت تفصیل سے کتابیں دیکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہاں وہ کتابیں ہیں جو میں نے ہندوستان میں کہیں نہیں دیکھیں۔ علامہ مجلسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا صحیفۂ کاملہ، رازی کے قلم سے تفسیر کی چند جلدیں، علمائے شیعہ کی متعدد تصانیف ان کی اپنی تحریر میں ہمارے یہاں موجود تھیں، لیکن اب کیا کیا جائے، میرے بسلسلۂ ملازمت ڈھاکہ (ڈھاکہ) میں قیام کے سبب سب ضائع ہو گیا۔“

(جواہر، شمارہ ۲، ۳، ص ۱۰۰)

اس نادر الوجود کتب خانے کی ساری کتابیں اب بکھر چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خزانہ ہندوستان کے مختلف شہروں ہی میں بکھرا ہوگا۔ گذشتہ چند سالوں میں ایران نے بڑی تعداد میں ہندوستان سے قلمی نسخے خریدے ہیں ممکن ہے کہ یہ سرمایہ اب وہیں ہو۔

زیارتِ عتباتِ عالیات

حمید صاحب نے ۲۰۱۲ء میں حج کیا۔ اس دوران کافی بیمار ہو گئے، حج سے واپسی کے بعد ان کی صحت کم ہوتی چلی گئی۔ اہم ہسپتالوں میں علاج کرایا گیا کچھ ہمت بندھی تو ۲۰۱۳ء میں زیارت عراق کے لیے بھیجے گئے۔ وہاں تفصیل سے زیارات کیں لیکن سامرا کی زیارت رہ گئی کیونکہ وہاں کے حالات اچانک خراب ہو گئے تھے۔ اس کے بعد

۲۰۱۷ء میں دوبارہ عراق گئے اور اس بار مکمل زیارات ہوئیں۔ وہ اس بات پر بہت مطمئن تھے کہ انہوں نے چہاردہ معصومینؑ کی زیارات مکمل کر لیں تھیں۔

بیماری، وفات اور مدفن

وہ ۹۰ برس کے ہو چکے تھے، معدے کی بیماری تو تھی ہی، لیکن پھر بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ بیماریوں کا مقابلہ کیا اور ڈٹ کے کیا۔ میری اُن سے آخری بار بات ۴ محرم کو ہوئی تھی۔ میں میاں چنوں (پنجاب) عشرہ پڑھنے گیا ہوا تھا وہیں ان کا فون آیا کافی دیر بات ہوئی، قیصر مسعود جعفری ان کے پرانے دوست میرے ساتھ تھے ان سے بھی بات ہوئی۔ کہنے لگے جب آئیں تو فوراً ملاقات کیجیے گا۔ میں ۱۴ محرم کو واپس آیا معلوم ہوا کہ حمید صاحب ہسپتال میں ہیں۔ ان کے داماد مسعود بھائی نے بتایا کہ ایک دن چلتے ہوئے پیر لڑکھڑایا اور گر گئے جس کے سبب خون کا دورانیہ تیز ہو گیا، اُلٹیاں آئیں، بعد میں معلوم ہوا کہ دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے جس کے سبب خون پھیل گیا ہے، وہ عمر کے اس حصہ میں تھے کہ آپریشن ممکن نہیں تھا، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا، اسی تکلیف میں ۲ دن گزار کے ۲۳ محرم ۱۴۴۰ھ مطابق ۴ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو اس دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔ نماز جنازہ ظہرین کے بعد رضویہ امام بارگاہ میں ادا کی گئی اور وادیٔ حسینؑ قبرستان میں سپردِ خاک کیے گئے۔ ان کی قبر کا نشان 6628-A ہے۔ خدا انھیں معصومینؑ کے جوار میں جگہ دے۔

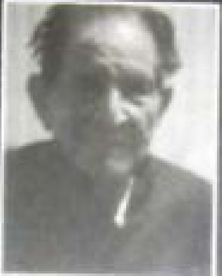

مجلس چہلم

برائے ایصالِ ثواب و بلندیٔ درجات

سید حمید حسین زیدی ابن مولوی محمد حیدر زیدی مرحوم

ہفتہ 10 نومبر — امام بارگاہ شاہ کربلا رضویہ سوسائٹی

قرآن خوانی 3 بجے سہ پہر — مجلس عزا 4 بجے شام

سوز خوانی: سید ابرار حسین فتح پوری و برادران — … مسعود جعفری

خطابت: ممتاز محقق ادیب و خطیب، ریسرچ اسکالر

علامہ

سید ارتضیٰ عباس نقوی

سوگواران: اہل خانہ

پروفیسر علی رضا شاہ مرحوم، سید ارتضیٰ عباس نقوی، سجاد حیدر جانی، سید حمید حسین زیدی مرحوم